میں، وہ

وہ ضعیف آدمی آج بھی پلیٹ فارم پر صبح اسی وقت آیا جیسے وہ روز آیا کرتا ہے۔ اس کی چال بھی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ ویسے ہی آگے کی طرف اس کا جسم جھکا ہوا، ہلکا سا خم کھایا ہوا، داہنا کاندھا کچھ نیچا اور بایاں ہاتھ کبھی سیدھا کبھی کمر پر رکھا ہوا، یہاں پھواری شریف کے اسٹیشن پر اپنی تجسّس بھری آنکھوں کے ساتھ آتا ہے۔ پہلے نمبر کے پلیٹ فارم پر جو خاصا لمبا ہے، دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ایک دم آخری سرے سے پہلے ایک بنچ پر بیٹھ جاتا ہے اور پٹنہ جنکشن کی طرف دیکھتا ہے۔

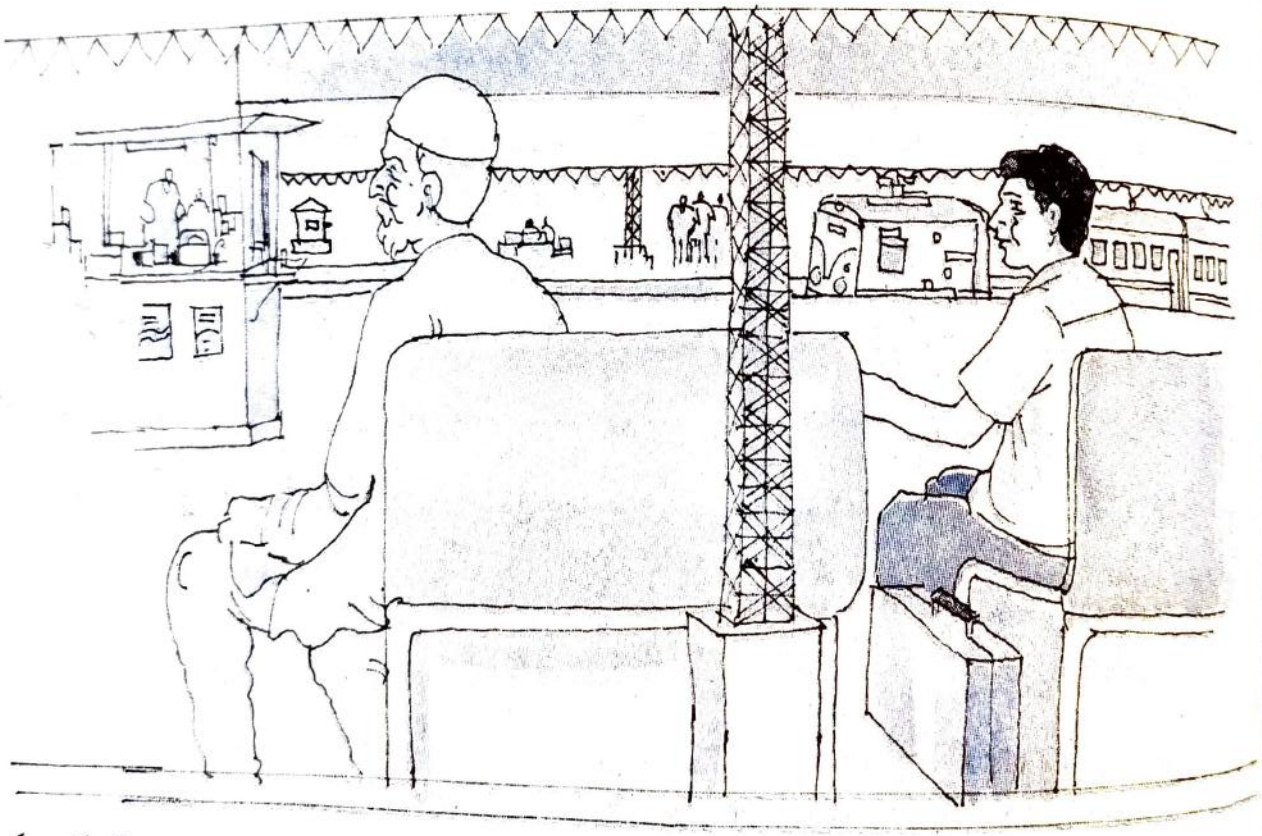

شاید اسے کسی کا انتظار ہے، مگر ہر روز .....؟ میں سوچتا ہوں اور کئی دن سے یہ منظر دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نے صبح کی سیر کی پابندی لگا دی ہے اور شام کو سڑک ناپنے کی پابندی اختر نے لگا دی ہے۔ جب سے اس ریلوے اسٹیشن کی حسن کاری ہوئی ہے، میں بھی دوسروں کی طرح صبح کو ادھر ہی آجاتا ہوں۔ اب صبح کے وقت بہت لوگ آجاتے ہیں۔ مردوں، عورتوں اور بچّوں کا ہجوم ہوتا

ہے، بہت چہل پہل رہتی ہے۔ پتہ نہیں، یہ ضعیف آدمی یہاں کب سے آتا ہے۔ صبح کی سیر تو اس کا مقصد نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ آکر اسی بنچ کے اسی ایک گوشے میں بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی چپل سے ایک پاؤں نکال کر دوسرے پاؤں کے گھٹنے پر رکھ کر ماتھے کا پسینہ رومال سے پونچھتا ہے۔ پھر اپنے کسی ایک ہاتھ پر ٹھوڑی لگا کر بڑے گمبھیر اور انگل ایکچول انداز میں دیکھتا ہے، کہیں بہت دور۔ سیر کر لینے کے بعد میں جب تھک جاتا ہوں تو اس سے کچھ دور والی بنچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی کبھی اپنی گردن گھما کر اسے دیکھ بھی لیتا ہوں۔ وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھتا۔ یا تو وہ سامنے دیکھتا ہے یا پھر پٹنہ جنکشن کی طرف جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ لیکن صبح کی ساری گاڑیاں جب پچھم کی طرف نکل جاتی ہیں تو کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھتا ہے اور آہستہ قدم چل کر بے حد تھکی سی آواز میں پان والے سے پوچھتا ہے۔

''آرہ کے لیے ٹرین کب آئے گی؟''

پان والا ہنس دیتا ہے اور روز کی طرح کہتا ہے: ''بابا وہ تو گئی۔''

''کب چلی گئی لیکن میں تو یہیں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔''

پان والا اس کی بات کا اب کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔

وہ پھر پوچھتا ہے ''آرہ والی ٹرین ......؟''

''اب کل آنا بابا۔'' وہ کچھ اُکتائی ہوئی آواز میں جواب دیتا ہے لیکن اسکی آواز میں شاید تھوڑا سا ترحم بھی ہے، یا شاید مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے۔

آج بھی وہ کونے والے بنچ پر آکر بیٹھ گیا ہے اور میں بھی تھک جانے کے بعد اخبار پڑھنے لگا ہوں۔ ہوا خوشگوار ہے اور املتاس کے پھولوں کا سایہ ہم دونوں کے سروں پر ہے۔ خبروں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اُوب کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت ڈی لکس دھڑ دھڑاتی ہوئی گزر گئی، بہت تیز رفتاری سے۔ اسے لمبا سفر جو طے کرنا تھا۔ دلّی سے ہوڑہ تک لمبے سفر کے لیے تیز رفتاری تو ضروری ہی ہے۔ اس کے بعد راجدھانی، شاہی ٹرین کی اپنی ہی شان تھی۔ بوڑھے آدمی نے اپنی گھڑی دیکھی۔ میں نے اس کی بنچ کے قریب جا کر کہا۔

''آج راجدھانی لیٹ ہے بابا۔''

''اب راجدھانی بھی ...'' بوڑھے آدمی نے پہلی بار مجھے مسکرا کر دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اُس سے بھی زیادہ بوڑھی معلوم ہوتی تھی۔

''ہوتا ہے بابا، ایسا بھی ہوتا ہے۔''

ہماری بات ختم نہ ہو پائی تھی کہ سمپورن کرانتی آ گئی اور اس چھوٹے سے اسٹیشن پر خدا معلوم کیوں رُک گئی۔

''اسے کیا ہوا جو یہاں...؟''

''آگے پٹنہ جنکشن پر پلیٹ فارم خالی نہ ہوگا۔''

''تمھیں ان ٹرینوں کی بہت واقفیت ہے''۔ وہ پھر مسکرایا، اس بار اس کی مسکراہٹ اور آواز اچھی لگی۔

''بہت تو نہیں بابا، بس تھوڑی سی کام چلاؤ معلومات رکھتا ہوں۔''

میں بھی اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔ سمپورن کرانتی کے مسافروں نے آئس کریم، پان، سگریٹ اور ناشتے کی کچوریوں والوں کو خوب نوازا۔ وہ ضعیف آدمی مسکراتا رہا اور میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے سفید بالوں میں اب تک لہریں باقی تھیں، گھنے سر کے بال، بچوں جیسے اس کے بے داغ چہرے پر اس کے سانولے پس منظر میں اچھے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا، ''یہ شخص خوبصورت رہا ہوگا۔''

''کیا سوچتے ہو بیٹا؟'' اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''سوچ رہا تھا بابا کہ آپ کس کے لیے آتے ہیں؟''

''میں''

''ہاں''

''میں اپنے آپ کے لیے آتا ہوں۔'' وہ ٹھنڈی سی آواز میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں''

''ایک وقت ایسا بھی آتا ہے بیٹا۔ سمجھ لوگے جب تم پر ایسا وقت کبھی آئے گا۔ میں تو جیون کا تیرتھ یاتری ہوں لیکن شاید جہاں پہنچنا تھا، وہاں پہنچ نہیں پایا، شاید راستہ بھٹک گیا، لیکن انتر آتما وہی ہے۔ یاتری کی انتر آتما۔''

''بابا پھر بھی میں سمجھا نہیں۔''

''تم نے زندگی کہاں دیکھی ہے بیٹا، تم کیا سمجھ پاؤ گے؟ یہ باتیں سمجھانے کی نہیں۔''

''نہیں خوب دیکھی ہے میں نے زندگی، اس جیون کے مہابھارت میں بڑا سنگھرش رہا ہے۔'' میں نے طاقت بھری آواز میں کہا۔

''بیٹا تم نے تپتی دوپہر میں چٹیل سڑک کے کنارے سائکل کا پنکچر بنوایا ہے کبھی؟''

''بابا وہ بات دراصل یہ ہے.....'' میں بوڑھے کے اس اچانک حملے سے گڑبڑا سا گیا۔

''تم مجھ کو سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ تمھارے پاس کچھ چھوٹ جانے کی یادیں نہیں ہیں۔ بچھڑے ہوئے چہروں کی ریکھائیں
آنکھوں میں نہیں ہیں۔تم نے لالٹین کے شیشے کو راکھ سے صاف کر کے،گرم تپتی ہوئی زمین پر جوٹ کا بورا بچھا کر بیٹھے ہوئے
ہوئے ،نیند کو نہ جاننے والی آنکھوں سے ،سلیٹ پر چکرورتی کے حساب نہیں لگائے ہیں ، لالٹین کے ٹوٹے شیشے کو پرانے پوسٹ
چپکا کر جوڑنے کا کشٹ کبھی نہیں جھیلا ہوگا ......''

لمبی سانس لیتے ہوئے وہ بوڑھا لمحے بھر کو رُکا۔ میں کچھ کہنے والا تھا کہ وہ پھر بولنے لگا۔

''تم نے معصوم ،بے غرض، بے ریا لوگوں کو نہیں دیکھا۔ بجلی آنے سے پہلے کی شانتی نہیں دیکھی ،تم تو Babylonian جلاوطنوں جیسی زندگی گزارتے ہو اور دل کی دنیا کے شرنارتھی ہو...'' اس کو کھانسی آگئی ،لیکن وہ اسی کھانسی میں بولتا گیا۔

''تم نے اعصاب زدہ زندگیاں گزاری ہیں۔ تمھیں کیا پتہ، آدمی کیا ہوتا ہے؟ دور سے آنے والی ہواؤں کی خوشبو کیا ہے؟ انتظار کیا ہوتا ہے؟ تمھیں تو محسوس کرنے اور گنگنانے کی فرصت بھی نہیں...''

''دنیا سب کا خون پی جاتی ہے۔'' میں نے کہنا چاہا، لیکن الفاظ میرے دل ہی میں رہ گئے۔

''بیٹا! ایسا تمھارے ساتھ کبھی ہوا ہے کہ پانی کوئی دوسرا پیے اور پیاس تمھاری مٹ جائے؟''

''نہیں، ایسا کبھی ہوتا بھی ہے کیا؟'' میں نے کچھ چڑ کر پوچھا۔

''نہ سمجھ پاؤ گے ابھی ...'' ہم دونوں کچھ دیر کے لیے چُپ ہوگئے۔ پھر میں نے ہمّت کر کے پوچھ لیا۔

آپ کون ہیں بابا؟''

بوڑھے کی پیشانی پھر شکن آلود ہوگئی۔

''وہ عہد و پیماں کے جزیرے جہاں محبت کی فصلیں اُگتی تھیں، تمھارے لائے ہوئے زہر کے سمندر میں ڈوب گئے۔ اب مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں؟ دل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو لوگوں کی پہچان بھی بند ہو جاتی ہے۔''

کس قدر جھکّی اور چڑچڑا ہے یہ بوڑھا ، میں نے دل میں کہا اور چُپ ہو رہا لیکن چلنے سے پہلے ہمّت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''بابا آپ کرتے کیا ہیں؟''

''میرا کیا پوچھتے ہو؟ خوش ہوں کہ دوسرے خوش ہیں۔ بھیڑ میں تنہا۔ پہلے تماشا دیکھتا تھا، اب خود تماشا ہوں، بلّوریں میں مقید مچھلی دیکھی ہے تم نے؟''

''جی ہاں''

''وہ مچھلی کھاتی پیتی ہے۔ ہر وقت تیرتی پھرتی ہے، سب اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن مچھلی تو شیشے کی دیوار کے اندر ہے۔ اسے بھلا کچھ نظر آتا ہوگا؟ اپنے کمرے کی راکنگ چیئر پر میں تھکا ہوا، مقید، کچھ کر گزرنے کی خواہش پر اب کچھ نہ کرنے کی خواہش چھا گئی ہے۔ وہاں بیٹھا بیٹھا چپ چاپ جتنی دنیا دکھائی دیتی ہے، دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں..... اب موت نہیں زندگی مایوس کرتی ہے۔'' وہ اٹھ کر آہستہ قدم چلنے لگا؟ وہ میرے ساتھ یا میں ہی اس کے ساتھ چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے سائے ایک ہو گئے۔ اس وقت اگر نزدیک سے بھی کوئی ہمیں دیکھتا تو اسے ہم دونوں ایک ہی لگتے۔ بہت وقت گزر گیا تھا۔

ایک ضعیف آدمی آج بھی اسی پلیٹ فارم پر صبح اسی وقت آیا ہے اور دور کی بنچ پر اسی طرح ایک کونے میں بیٹھ گیا ہے۔ املتاس کے پھول بھی اسی رنگ میں اوپر کھلے ہوئے ہیں۔ گاڑیاں آج بھی یوں ہی آ اور جا رہی ہیں۔ راجدھانی، ڈی لکس، شرم جیوی، سپورن کرانتی ..... خوش دلی کے شب و روز کے سبز جزیرے جنھیں زہر کے سمندر کے کسی گوشے نے چھپا لیا ہے۔ خالی نگاہیں دور وہاں دیکھ رہی ہیں جہاں کچھ نہیں ہے۔

اور جب پلیٹ فارم پر سناٹا ہو گیا تو اس نے پان والے سے پوچھا۔ ''آرہ جانے والی ٹرین کب آئے گی بھائی؟''

''وہ تو گئی بابا۔''

''لیکن یہ کیسے ہوا؟'' وہ کچھ زیرِ لب سا بڑبڑاتا ہے۔ ''میں تو یہیں اس بنچ پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا، پھر کیسے؟''

''اب کل آنا بابا۔'' وہ کچھ اکتائی ہوئی آواز میں جواب دیتا ہے۔ لیکن اس کی آواز میں شاید تھوڑا سا ترحم بھی ہے، یا شاید مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے۔

پان والے کے آئینے میں میری بوڑھی صورت ایک لمحے کے لیے جھلک جاتی ہے۔ دھوپ اب جگہ جگہ پھیلنے لگی ہے۔ نئے دن کا آغاز، کہ دوسرا آغاز اور نیا اختتام اور کوئی نیا مستقبل..... سب کچھ بدلتے ہوئے آسمان میں سمٹنے لگا ہے۔

(شفیع جاوید)